نابلس کے ایک اچھے اسکول "الرشادیہ الغربیہ" میں ابراہیم نے ابتدائی تعلیم حاصل کی یہاں چار سال گزارنے کے بعد ثانوی تعلیم کی تکمیل کے لئے "القدس" کے سینٹ جارج مشنری اسکول (مدرسۃ المطران) میں داخل ہوئے جہاں ان کے بھائی احمد شعبۂ انگریزی کے طالب علم تھے۔ ۱۹۱۹ سے ۱۹۲۳ تک یہیں قیام رہا۔ اس کے بعد جامعہ امریکہ بیروت آگئے جہاں ادیبوں اور شاعروں کی وجہ سے شعرگوئی کے لئے تحریک پیدا ہوئی۔ ابراہیم نے یہاں کے ادبی ماحول سے فائدہ اٹھایا اور نظمیں کہیں لبنانی اخبارات نے شائع کرکے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ یہیں حافظ جمیل عراقی، شامی وجیہ البارودی، عمر فروخ سے رہ ورسم آشنائی ہوئی۔ ذوق ومشرب کی ہم آہنگی نے انکے دوستانہ تعلقات کو نئی ادبی شکل دے دی اور ان تمام احباب نے مل کر "دارالندوہ" کے نام سے ایک ادبی حلقہ قائم کرلیا۔ اس سے وابستہ تمام شاعروں نے اپنے لیے دور عباسی کے شعراء کے ادبی نام منتخب کرلئے ابراہیم نے اپنا نام عباس بن احنف، وجیہ البارودی نے دیک الجن الحمصی، حافظ جمیل نے ابونواس اور عمر فروخ نے صریع الغوانی نام اختیار کیا۔ اس ادبی تنظیم کا ایک دفتر بھی تھا جس میں ادبی محفلوں کی رپورتاژ محفوظ رکھی جاتی تھیں۔ آخر میں شخصی اختلافات کی بنیاد پر ابراہیم نے اس سے قطع تعلق کرلیا اور عمر فروخ کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا کہ "میں نے اس سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے، نیکول نے مجھ سے قصیدہ "یا تین یاقوت" مانگا اور تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ اپنے اچھے دوستوں سے بھی ہوشیار رہو"

جامعہ بیروت میں ان کی شاعری کا سلسلہ زور وشور سے جاری رہا۔ "شاعر الجامعہ" کی حیثیت سے شہرت بھی حاصل کی اور محبت کا پہلا تجربہ بھی یہیں پر ہوا کہ وہ ایک فلسطینی دوشیزہ کے دام عشق میں گرفتار ہوگئے جو زیادہ خوبصورت تو نہ تھی لیکن کھلتا ہوا قد، گیہواں رنگ، چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ، رفتار میں لاابالی پن اور بے نیازی نے ابراہیم کے دل کو گھائل کردیا۔ رفتہ رفتہ اس بت طناز نے اس کے رواق دل میں اپنا گھر بنالیا۔ دھیرے دھیرے بہت سے دلوں کی دھڑکنیں اس کے لیے تیز ہونے لگیں اور اس کے ساتھ اس کے قدم بھی نزاکت سے آشنا ہوتے گئے اور وہ اپنے بے پناہ حسن سے باخبر ہوتی گئی۔ ابراہیم نے اس کے نام کا ایک قصیدہ بھی لکھا مگر نوشتۂ تقدیر میں وفا کی جگہ بے وفائی، وصال کے بدلے جدائی لکھی تھی۔ ابراہیم روٹھے اور شاعری کی لے میں اداسی سماگئی، مطرب نے ایسی غزل چھیڑ دی کہ ہر دل کو

چوٹ سی لگی اور سر آنکھ بھر آئی۔ اب دل کی گہرائی سے شاعرانہ جذبات امڈنے لگے۔ شاعری کو نیا انداز اور زندگی کو نیا موڑ مل گیا۔ دل کچھ اس طرح سے ٹوٹا پے در پے وفائی کے اس حادثے نے کہ سگریٹ اور شراب غم کا مداوا اور جینے کا سہارا بن گئے اور یہ لت ایسی پڑی کہ اطبا کے منع کرنے کے باوجود بھی ظالم منہ سے لگی رہی۔ اس درد بے دوا نے زیست کا نیا لطف دیا اور زندگی کی ساری مستیاں شراب میں قید ہوگئیں۔ یہی شراب تھی جو ساری اداسیوں کو بہائے جاتی تھی اور سگریٹ تمام فکروں سے بے نیاز کرتا جاتا تھا۔

جون ۱۹۲۹ء میں ابراہیم نے بیروت سے بی ایس سی کی ڈگری تو حاصل کرلی تھی مگر تدریس کے پیشے سے ان کو توحش سا تھا اس لیے انہوں نے صحافت کی دنیا میں آنے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ اسی مقصد کی خاطر اپنے والد محترم کے ساتھ مصر کے عازم سفر ہوئے۔ یہاں وہ مختلف صحافتی اداروں میں گئے مگر بیٹ کے درد کی شدت نے انہیں نابلس لوٹنے پر مجبور کر دیا جہاں والد معظم کے اصرار پر بادل نخواستہ "مدرسۃ النجاح" میں تدریسی خدمت انجام دینے پر راضی ہوگئے مگر اس تدریسی کام پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے رہے۔

یہاں ایک سال مکمل ہوتے ہی ۱۹۳۰ء کے اواخر میں انیس الخوری المقدسی نے جامعہ امریکیہ بیروت بلالیا جہاں تین سال تعلیم دینے کے بعد بعض سیاسی وجوہ کی بناپر ابراہیم کو استعفیٰ دینا پڑا۔ مگر حلیم نجار اور حبیب کوران کی درخواست، بیروت کی سرزمین سے محبت اور جامعہ کے ارباب حل وعقد کے اصرار پر لوٹ آئے۔ یہاں قیام کے دوران ان کی ملاقات دکتور نیکل البوھیمی سے ہوئی جنہیں عربی ادبیات پر مکمل دسترس کے ساتھ چیکوسلواکی، فرانسیسی انگریزی، جرمنی اور اسپینی زبانوں پر بھی استادانہ مہارت حاصل تھی۔ غزل عربی کے متخصص کی حیثیت سے ادبی دنیا میں ان کی الگ پہچان تھی۔ انہوں نے ابن حزم اندلسی کی کتاب "طوق الحمامہ" کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور ابراہیم کے تعاون واشتراک سے ابو داؤد اصفہانی کی "کتاب الزھرۃ" کی تحقیق وتدوین کی جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ اسی زمانے میں نیکل کے ساتھ ابراہیم کی ملاقات ایک اسپینی رقاصہ "مارگریٹا" سے ہوئی جس کے اندلسی حسن بلاخیز سے

(باقی ص۲۳ پر)

چمنستان فارسی کی آبیاری میں شہر الہ آباد کا حصّہ

محمد ذاکر حسین ندوی لکچرر شعبۂ فارسی ۔ ایس، ایس ایم، این، این جنتا کالج کھاجے ڈیہہ دھوبنی

فارسی زبان کی یہ خوش قسمتی اور زیبا طالعی ہے کہ وہ صدیوں تک ہندوستان کی سرکاری زبان رہی اور اس کی زلف سنوارنے اور گیسو آراستہ کرنے میں ہندوستانی شاعروں اور ادیبوں کی خدمات ایرانی ادبار و شعراء کے مقابلہ میں کم نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی انشاپردازوں نثر نگاروں، ادیبوں، شاعروں، محققوں اور تنقید نگاروں کی خدمات کو نہ صرف ہند و بیرون کے محققوں نے بلکہ خود اہل زبان ایرانیوں نے بھی سراہا ہے اور عظمت و وقعت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اس موقعہ پر یہ کہنا کہ صائب تبریزی، غنی کشمیری کو کس قدر عزیز رکھتے تھے اور عزت و حرمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے تو بے محل نہ ہوگا۔ تذکروں میں آتا ہے کہ ایک ہندوستانی سیاح صائب تبریزی کی ملاقات کی غرض سے اس کے پاس گیا تو اس نے پوچھا کہ میرے لئے ہندوستان سے کون سا تحفہ لیکر آئے ہو؟ اس سے ان کا مقصود غنی کشمیری کے تازہ اشعار تھے۔ اسی طرح یہ مقولہ بھی زبان زد خاص وعام ہے کہ شاہ عباس بزرگ کہا کرتا تھا کہ ابو الفضل کے قلم سے جتنا مجھے خوف اور ڈر لگتا ہے اتنا اکبر کی تلوار سے نہیں۔ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی شعراء وادبا کی عظمت کی قدر ایرانیوں کی نظر میں تھی۔

دہلی، لاہور اور آگرہ ہندوستان میں فارسی ادبیات کے عظیم مراکز شمار ہوتے تھے۔ لیکن اس کے علاوہ کچھ چھوٹے چھوٹے علم وادب کے گہوارے بھی ہندوستان کے مختلف شہروں میں موجود تھے جو مذکورہ تین مرکزوں سے کسی اعتبار سے فروتر نہیں تھے۔ لیکن بہت دنوں تک ان بڑے مراکز کے سحر میں قدر دان علم وادب ایسے کھوئے رہے کہ کسی کی نظر ان چھوٹے مراکز کی طرف نہیں گئی۔ ان چھوٹے علمی وادبی گہواروں میں الہ آباد کا مردم خیز شہر بھی آتا ہے اور افسوس کی بات ہے

کہ یہی شہر سب سے زیادہ قعر گمنامی میں پڑا رہا۔

عہد مغول یا اس سے بہت پہلے جبکہ الٰہ آباد قانونی اعتبار سے عالم وجود میں نہیں آیا تھا اس کے ارد گرد ایسے مراکز موجود تھے جو ادبی و علمی قدر و قیمت کے اعتبار سے کافی اہمیت کے حامل تھے اور جب یہ شہر آباد ہوا تو تمام مراکز اس شہر میں منتقل ہو گئے اور ان کو ایک مرکزیت حاصل ہو گئی

الٰہ آباد جو گنگا جمنا ندی کے سنگم پر واقع ہے، ودا جم کے دور میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ گرچہ اس زمانے میں الٰہ آباد اس کا نام نہیں پڑا تھا بلکہ پریاگ کے نام سے مشہور تھا۔ اس زمانے میں یہاں ہندو رشی منیوں اور جوگیوں کا مسکن، ریاضت کشوں اور مراقبہ نشینوں کا مخزن، معلموں اور طالب علموں کا گہوارہ تھا اور دیر بازیوں کا ایک عظیم علمی و ادبی مرکز تھا۔

یہ مقدس شہر علمی مرکز کے اعتبار سے اس لئے بھی وقعت و عظمت کا حامل ہے کہ یہاں معروف رشی منی بھاردواج کی اقامت اور تعلیم گاہ موجود تھی۔ ان کی تعلیم گاہیں اس محلہ سے جو آج بھاردواج آشرم کے نام سے جانا جاتا ہے، زیر روڈ تک پھیلی ہوئی تھیں اور متعدد رشی منیوں کا گروہ بھی اس علاقہ میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔ مہابھارت کی اس روایت پر تو کلی طور سے یقین کرنا محال ہے کیونکہ مختلف ادوار میں یہ کتاب لکھی گئی اور متعدد حضرات کا اس کی تصنیف میں ہاتھ رہا ہے نیز بہت سارے اضافات و ترمیمات بھی اس میں واقع ہوئے ہیں۔ لیکن تاریخ میں حضرت مسیح سے قبل بھاردواج نامی ایک ہندو رشی منی کا نام ضرور ملتا ہے۔

جب اسلامی پرچم ہندوستان کی مردم خیز زمین میں مستحکم ہو گیا تو اسلامی مبلغین اور صوفیا کی توجہ کا مرکز یہ شہر بنا رہا اور یہ حضرات تعلیم و تعلم کے ساتھ تبلیغی کاموں میں لگے رہے اور جب شاہنشاہ اکبر اعظم کا دور حکومت آیا تو انہوں نے ایک قلعہ تعمیر کرا کر اس کا نام "الٰہ آباد" رکھا۔ ویلیام بیل، مفتاح التواریخ میں لکھتا ہے کہ اکبر نے ایک قلعہ بنایا اور وہ شہر جو یہاں موجود تھا، اس کا نام الٰہ آباد رکھا اور عہد شاہجہانی میں الٰہ آباد کے نام سے کافی مقبول ہوا۔ بہر حال یہ شہر زمانہ قدیم ہی سے مذہبی و روحانی، علمی اور ادبی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے علماء و فضلاء اور نابغۂ روزگار و یگانۂ دہر نے دوسرے مقامات سے ہجرت کر کے اس شہر کو اپنا مسکن بنایا اور اپنی تبحر علمی سے قدیم و جدید علوم و فنون اور فارسی ادبیات کے

دامن کو انمول اور قیمتی جواہرات سے مالا مال کیا۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی کے حملے کے بعد ملتان کا علمی و ادبی، تہذیبی و تمدنی اور مذہبی و روحانی اثر و نفوذ شمالی ہندوستان میں تیزی سے اثر پذیر ہوا۔

اور جب سلطان التمش کا دور حکومت آیا تو شہر اللہ آباد اسلامی علوم و فنون کا مرجع ہو گیا سید قطب الدین الحسنی پہلے شخص ہیں جو اس سرزمین میں علوم اسلامی کے بڑے عالم و فاضل کی حیثیت سے مسند مشہور پر جلوہ افروز ہوئے۔ وہ ۵۸۱ھ میں غزنی میں موجود تھے۔ تذکرہ نگاروں کے قول کے مطابق چونکہ اس وقت ہندوستان میں تبلیغی کاموں کی راہ پوری طرح ہموار تھی۔ اس لئے سید قطب الدین الحسنی نے دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اس خطہ کا رخت سفر باندھا۔ ہندوستان کے تمام ادبی تذکروں میں ان کے حالات ملتے ہیں تذکرہ علمائے ہند کے مصنف نے ان کو متبحر عالم شمار کیا ہے۔ تذکرہ نگاروں کی روایت کے مطابق وہ صاحب تصنیف بھی تھے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ آج ان کے علمی و ادبی سرمائے ہمارے درمیان نہیں ہیں۔

خلجی دور میں اس شہر کی اہمیت علمی اعتبار سے اور بڑھ گئی۔ شیخ علاء الحق پنڈوی اور مجذوب شاہ کرک نے اس شہر میں اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت میں اہم رول ادا کیا ہے۔ مجذوب شاہ کرک تو فارسی میں طبع آزمائی بھی کیا کرتے تھے۔ ویلیام بیل کے مطابق مندرجہ ذیل شعر میں شاہ مجذوب کرک نے جلال الدین خلجی کے قتل کی پیش گوئی کی تھی ؎

ہر کہ بیاید بر سر جنگ — تن در کشتی سر در گنگ

نثری نگارشات میں شاہ کرک کے ملفوظات اور اقوال خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ سخن سرائی میں ان کی رباعیات بہت زیادہ مشہور ہوئی تھیں۔ ذیل کی رباعی میں وہ قناعت اور اس خطہ کی اہمیت بتاتے ہوئے کہتے ہیں ؎

قانع شدہ ام بہ خشک نانی و تبرہ — میلم نبود بسوی بریان و برہ
دہلی و سمرقند و بخارا و عراق — این چار ترا باد و مرا بادکرہ

"تذکرہ بحر زخار" کے مؤلف شاہ وجیہہ الدین نے اس شعر کو شاہ کرک کے کلام کے نمونے کے

[illegible] کیا ہے ؎

اندر طلب دوست چو مردانہ شدم اول قدم آن بود کہ بیگانہ شدم

شاہ کرک کے بعد شاہ جلال الدین مانکپوری اور شاہ حسام الدین مانکپوری دنیائے علم و ادب میں درخشاں ستارہ کی مانند رونق افروز ہوئے اور اپنی علم دوستی اور ادب پروری سے گلشن فارسی کو سینچا اور سنوارا۔ شاہ حسام الدین کے ملفوظات تو فارسی زبان کی عظیم یادگار ہیں۔

خلجیوں کی حکومت کے اختتام کے بعد ملک ہندوستان تغلقی سلاطین کے زیر نگیں آگیا۔ اس عہد میں الٰہ آباد کا قصبہ خصوصی توجہ کا مرکز بنا رہا اور فارسی ادبیات کی ترقی میں ہمہ دم گامزن رہا۔ اس دور کی نمایاں شخصیتوں میں شاہ تقی مخدوم اور شاہ معین الحق کا نام سر فہرست ہے۔ شاہ تقی مخدوم نہ صرف مبلغ اسلام کی حیثیت سے بلکہ فارسی شاعر کے اعتبار سے بھی کافی مشہور ہیں۔ وہ صاحب دیوان شاعر تھے اور صوفیانہ اسرار و عارفانہ نکات کو رباعی کے قالب میں بیان کرتے تھے۔ لیکن ان کے اشعار کا مجموعہ ابھی تک پردۂ گمنامی سے نہیں نکلا ہے۔ البتہ تذکروں میں ان کی رباعیوں کے نمونے ملتے ہیں ؎

رخت ہستی بر سر دیوار بسیار می باید کشید عمر اندک ست و می بسیاری باید کشید

قطرہ اشکم اگر شد بر در مژگان گرہ خوب شد اغاز را بر وار می باید کشید

مجموعی اعتبار سے تغلقوں کے دور میں یہ شہر اسلام اور ادبیات فارسی کا اہم مرکز تھا اس دور کی سیاسی اتھل پتھل اور انقلابی ہرج مرج کی کوئی خاص بات مشہور نہیں ہے۔ سلاطین دہلی کے وقت تک اس شہر کی ادبی اہمیت برقرار رہی۔

سلاطین دہلی کی حکومت ۱۵۲۵/۹۳۱ء تک قائم رہی۔ اسی سال مغلیہ سلسلہ کے بانی بابر کے ہاتھوں ابراہیم لودی کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور گورگانیوں کی حکومت وجود میں آئی۔ مغلوں کے ابتدائی عہد میں الٰہ آباد کی سابق ادبی و سیاسی اہمیت کچھ باقی رہی۔ بعد میں یہ شہر تاریخ کی دنیا سے علیحدہ ہوگیا اور گمنامی کے اتھاہ سمندر میں جا گرا۔ لیکن گمنامی کے باوجود اپنے قدیم تقدس کی حفاظت میں برابر لگا رہا۔ یہی سبب ہے کہ بابر نے

اپنی تزک میں اس مقدس شہر پریاگ کا نام لیا ہے۔ اس کے بعد ۱۵۰۳ء تک اس کی ادبی اور سیاسی تاریخ نہیں ملتی ہے۔

بادشاہ اکبر نے جو اپنی غیر معمولی صلاحیت اور کوشش سے اپنی حکومت کو استحکام اور دوام بخشا، اس کی سیاسی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے قلعہ کی تعمیر کا حکم دیا اور الہ آباد جو جھو اور کڑہ مانک پور کو جغرافیائی اعتبار سے ایک کر ایک بڑے شہر کا بنیاد ڈالی۔ ابوالفضل اس شہر کی تاسیس پر یوں رقمطراز ہیں۔

"بہ ساعت خجستہ اساس شہر الہ آباد نہادند"

(اکبر نامہ ۳/۶۱۲)

شہر الہ آباد ۱۵۹۹ء سے ۱۶۰۵ء تک متعدد سیاسی ہرج مرج اور مختلف انقلابی شورشوں کا مرکز بنا رہا۔ اس سیاسی کشمکش کے دوران جہانگیر کا قیام خاص اہمیت کا حامل ہے جس کے نتیجہ میں ابوالفضل علامی جیسے دانشور قتل کر دیئے گئے۔ اس سیاسی آلودگی کے باوجود شاہ ابوالمعالی الہ آبادی اور قاضی یعقوب مانک پوری علمی و ادبی سرگرمیوں میں فعال بنے رہے۔ لیکن افسوس کہ ان کے علمی آثار اور ادبی کارنامے اب متداول نہیں ہیں۔

عہد جہانگیر میں کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی ہے جس کا نام لیا جائے۔ علم کی اس کساد بازاری کا سبب سیاسی گرمیوں کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ شخصیت سے مراد یہ ہے کہ جس کا نام اس دور کے تذکروں اور تاریخی کتابوں میں علم و ادب کے خدمت گزار کے عنوان سے آیا ہو۔

جہانگیر کے بعد ہندوستان کا تخت و تاج شاہجہاں کو ملا۔ حکومت کی بازیابی میں انکو ایسے شورشوں اور انقلابوں کا سامنا کرنا پڑا جو الہ آباد میں برپا ہوئے تھے۔ اس کا تذکرہ اجمالی طور سے تاریخی کتابوں میں اور تفصیلی انداز میں خلاصۃ التواریخ میں ملتا ہے۔ ان تمام شورش بازیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے باوجود شاہجہاں کا دور حکومت مغلیہ سلطنت کا دور زریں کہلاتا ہے۔ خاص طور الہ آباد کے لئے یہ دور بہت مفید اور کارآمد تھا۔ کیونکہ اس کے عہد میں نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند کے علماء و فضلاء کی توجہ کا مرکز یہ شہر بنا رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ